سرسیّد: مصدرِ اقبال

(فکری سیاق کے حوالے سے)

پروفیسر عبدالحق

اسے فکر و نظر کا استعجاب کہیے یا دنیائے ادب کی حیرت فزائی کہ ایک عظیم فن کار استفادے اور استخراج کے اتنے گوناگوں مصادر کا حامل ہو جس کی نظیر علم و دانش میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے بیشتر قابلِ ذکر فلاسفہ، فن کار، صحائف، انبیا کے اقوال و آثار اور مختلف النوع تصورات کا ایسا دل نشین مرکب اقبال کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں اخذ و استنباط کی نوعیت پر گفتگو مقصودِ خاطر نہیں ہے، صرف ایک سرچشمۂ دانش کے مؤثرات کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا۔

میں اقبال کو سرسیّد کے مشن کی تجدید اور توسیع سمجھتا ہوں۔ علمی و فکری سطح پر اس مشن اور منصوبے کی تکمیلی صورت کا نام ہی اقبال ہے۔ سرسیّد کے علم و عمل نے افکار کی آویزش کا جو سیل پیدا کیا اسے مربوط و منظّم فکر کی صورت اقبال نے دی۔ فکری عناصر ہوں یا اس کے اجزا و ابعاد کہیں نہ کہیں ان کا سررشتۂ فیض سرسیّد سے ملے گا۔ راقم نے بہت پہلے ۱۹۶۹ء میں اپنی پہلی کاوش میں یہ اعتراف کیا تھا۔ بعدازاں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحریر نے مجھے مزید تقویت بخشی کہ اقبال کو اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف اقبال پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ برصغیر کی مسلم روایت دانش میں مرشدِ معنی کے افکار کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔

یہ مسلم ثقافت کی معجز نمائی ہے کہ انحطاط کے فتنہ وفسوں میں بھی حیات بخشی کے امکانات روشن رہے اور معاشرے کو مہمیز کرتے رہے ہیں۔ فکری تبحر اور تجدید نے نئے نئے عنوان سے تیرہ و تاریک فضا کو روشن کیا ہے۔ اس سوادِ عظیم کے علم و عمل کی اساس اور ترفع میں، عبقری فکر تسلسل کے ساتھ کارفرما رہی ہے۔ شیخ مجددِ سرہندی سے شاہ ولی اللہ دہلوی، سرسیّد احمد خاں اور شیخ محمد اقبال کے نفوذ سے ہی یہ معاشرہ تابکار ہے۔ اس سیل کی فکر میں دوسرے ضمنی اور اضافی تصورات بھی معاون رہے

ہیں مگر ہماری شناخت اسی فکری تسلسل کے اقرار اور اعتراف کے سبب ہے۔ شرح و بیاں کی تفصیلات سے قطعِ نظر عرض ہے کہ ولی الٰہی تحریک سے سرسیّد کا براہِ راست تعلق ہے اور موخرالذکر نے اقبال کے قلب و نظر کو کشادگی اور فراخی بخشی ہے۔ میں پیشین گوئیوں کا نہ معتقد ہوں اور نہ ہی مرعوب۔ جیسے پیکرِ اقبال میں روحِ غالب کا حلول کرنا یا اگر سرسیّد نہ ہوتے تو فارسی زبان میں خودی کا فلسفہ نازل نہ ہوتا یا حالی نہ ہوتے تو اقبال کی شاعری نہ ہوتی جیسے اقوال بے معنی ہیں۔ ہر مفکر اور مجتہد نہاں خانۂ ازل سے اپنی متاعِ فکر کا مالک ہوتا ہے مگر وہ اسلاف کی فکری یافت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ انسانی فلسفہ و ادراک ایک فکری تسلسل کا نام ہے جو ردّ و قبول کے باوجود رواں دواں رہتا ہے۔ وحدتِ فکر میں ارتباط و انضمام کے عمل کی کارفرمائی بھی نمایاں رہتی ہے۔

ولی الٰہی تحریک سرسیّد کے استفادے اور نشوونمائے ادراک کی ترتیب اور تربیت میں مرکزی مقام رکھتی ہے۔ اسی خانوادے کے فرزندانِ ارجمند شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید سے ذہنی و فکری قربت کے احوال محفوظ ہیں۔ مولانا حالی سے لے کر بشیر احمد ڈار تک سنجیدہ مصنّفین کی کاوشیں ہماری راہ نما ہیں۔ یہی تعلق ہے جو سرسیّد کے شب و روز کی بصیرتوں میں ڈھل کر شعبہ ہائے حیات پر محیط ہو جاتا ہے۔ ان کی عقابی نظر صرف معاشرے کی اصلاح پر ہی مرتکز نہیں ہے وہ آگے بڑھ کر اجتہاد کی سرحدوں کو بھی عبور کرتی ہے اور اجتماعی لہجے کی بدولت احساس میں ہلچل پیدا کرتی ہے۔ اس منزل کے آگے ندرتِ فکر و عمل کے انقلاب کی داعی بن جاتی ہے اور فرد کے وجود سے معاشرے کے ممکنہ حدود پر کمندیں ڈالتی ہے۔ ان انقلاب آفرین تصورات کو محض اصلاحی تحریک کا نام دے کر مطمئن ہو جانا دراصل اس خام نظر کی بدتوفیقی ہے جو اسی پر قانع ہے۔ وہ اس لازوال تحریک اور فعالیت کے جوہر کو دیکھنے سے قاصر ہے جو تقدیرِ امم بدل دینے کا عزم رکھتی ہے۔ جدید اسلوبِ فکر کا مطالبہ ہے کہ ہم مغلوب ذہن کی درماندگی سے دور ہو کر ان تازہ کار منصوبوں کے سیاق کی مہم جوئی میں مشغول ہوں اور پُروقار زندگی جینے کا دستورالعمل ترتیب دیں۔ یہ نہ اسرار بینی ہے اور نہ ہی ادّعایت بلکہ سرسیّد کی تفہیم اور ان کے تصورات کی باز آفرینی کی عاجزانہ کوشش ہوگی۔ اسے صرف اصلاح تک محدود نہ کریں۔

کبھی گل کہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر

اس سعی کے حاصلات پر ہی معاشرے کا استحکام اور اقتدار کا انحصار ہوگا۔ سرسیّد کی اجتہادی فکر ممدوح بھی بنی اور مذموم بھی، جس میں عوام و خواص بھی شامل ہیں۔ علما کا ایک بڑا گروہ اختلافی آرا کو شہ دے رہا تھا اور درپے زیاں تھا۔ پنجاب کے اکابر علما بھی تنبیہ و توبیخ میں آگے ہی تھے۔ چند ہی عالم ان کے ہم خیال تھے۔ جن میں مولانا سیّد میر حسن پیش پیش ہی نہیں سرسیّد کے بڑے معاون و موید تھے۔ وہ ہر طرح ان کی تحریک کے تحفظ کے لیے تیار رہتے۔ خود بساط بھر دامے درمے مدد پہنچاتے اور دوسرے حضرات کو بھی متوجہ کرتے۔ غبن کے خسارے کی تکمیل کے لیے ان کی کوشش کو

سرسیّد نے بہ نظرِ استحسان تسلیم کیا ہے اور سپاس گزاری میں فراخ دلی کے ساتھ ممنونیت کا اقرار کیا ہے۔ سرسیّد جب کبھی پنجاب کا دورہ کرتے مولانا استقبال کرتے اور پذیرائی فرماتے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے انعقاد کا اہتمام کرتے اور کھلے لفظوں میں تحریک کا تعارف کراتے۔ وہ سرسیّد کی دعوت پر علی گڑھ بھی تشریف لاتے وہ ۱۸۷۳ء میں یعنی ۳۰ برس کے پُرجوش جواں سال زمانے میں سرسیّد سے ملے ۱۸۷۷ء میں وائسرائے نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مولانا اس تقریب میں شریکِ محفل تھے۔ مولانا سرسیّد کے علمی کاموں سے بھی کمال شغف رکھتے۔ تفسیری مباحث میں ان کے اسفسارات شاہد ہیں کہ علمی وفکری سطح پر بھی دونوں میں بڑا قرب تھا۔ دونوں کی مراسلت گہرے تعلقات پر مبنی ہے۔ مکتوباتِ سر سیّد میں مولانا کے نام دس خطوط ہیں جو دوستانہ روابط کے مظہر ہیں۔ یہ وہی مولانا میر حسن ہیں جو علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی روایت کے امین ہیں اور جو شیخ محمد اقبال کے استاذِ کل اور اقبال گر بھی کہے جاتے ہیں۔ اقبال کے بیشتر ناقدین نے اقبال کی فکری تشکیل میں اس عنصر کی اہمیت کی وضاحت کی ہے۔ ذکرِ اقبال میں عبدالمجید سالک نے مولانا کی شخصیت اور اثرات کے پیشِ نظر علاحدہ ایک باب قائم کیا ہے۔

> مولانا میر حسن کے فیضِ تربیت سے اقبال برابر بہرہ اندوز ہوتے رہے اور فاضل وشفیق استاد نے اس جوہرِ قابل کو علم وحکمت، شعر وادب، فارسی وعربی زبان دانی اور فکرِ صحیح کے محاسن سے مالا مال کر دیا۔ علامہ اقبال بھی مولانا کے عزو احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے اور ۱۹۲۹ء تک جب مولانا کا انتقال ہو گیا ہمیشہ جب کبھی سیالکوٹ جاتے اس آستانۂ علم پر جبہ سائی سے ہرگز غفلت نہ کرتے۔
> (ذکرِ اقبال: ص ۱۶)

خود علامہ کے اقرار کی صداقت کے بعد کسی اور حوالے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یورپ جانے سے قبل کی ۱۹۰۴ء کی نظم 'التجائے مسافر' کے اشعار ہی اس نسبت پر قولِ فیصل کا درجہ رکھتے ہیں:

وہ شمعِ بار گہِ خاندانِ مرتضویؓ
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

ابتدائی دور کے کلام میں ایک اعلانیہ حرفِ آخر کی سند رکھتا ہے:

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

گویا مولانا سیّد میر حسن کے توسط سے سرسیّد تک رسائی کے واضح نشانات موجود ہیں اور اقبال و

سرسیّد کے درمیان سیّد میر حسن ہی نقطۂ اتصال ہیں۔ یوں بھی اقبال کی چشمِ حقیقت بیں نے سرسیّد کی زندگی کے ۲۱ سال دیکھے اور پھر سر راس مسعود کے پیکرِ اخلاص میں سرسیّد کی شفقت اور دل نوازی کی سعادت براہِ راست حاصل کی۔ سر راس مسعود مرحوم نے اقبال کی مشکل وقتوں میں جو مدد کی ہے اس کے لیے پوری ملت سرسیّد کے جگر گوشے کی ممنونِ احسان ہے۔ بڑے بڑے فرماں رواؤں کے کنزو کشکول اقبال کے لیے خالی تھے۔ حکیم الامت کے علاج و اعانت سے اعراض ناقابلِ معافی ارتکاب جرم تھا۔ سیّد کے نورِ نظر کا ملت پر احسان باقی ہے۔ اقبال کو ان پر کیا کیا ناز اور اعتماد تھا، یہ ان کے وصیت نامے کی عبارت سے عیاں ہے۔ ان کی ناگہانی وفات پر اقبال کو جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ اس نظم کے حرف وصوت سے محسوس کیا جا سکتا ہے:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
نہ کہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

غالب سے صرفِ نظر کر لیں تو اقبال نے جس شخصی رثائی تخلیق کی ابتدا سرسیّد سے کی تھی وہ داغ، والدہ مرحومہ سے ہوتی ہوئی فلسفہ وشعر کے عروج کے ساتھ راس مسعود مرحوم پر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا ابتدا اور انتہا دونوں میں اقبال کے قلبی واردات اور فکر ونظر کی کیفیات کا دل نشین ارتباط اسی خاندان کے تعلق سے قائم ہے۔ ۱۹۰۳ء میں لکھی گئی نظم 'سیّد کی لوحِ تربت' کا تجزیہ بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ وہ الگ عنوان کا متقاضی ہے۔ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے شعر و پیغام کے پُرشکوہ آغاز کی حامل یہی نظم ہے۔ شاعری پیغمبری کی ہم دوش ہو کر آواز دیتی ہے:

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جانے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

لوحِ تربت کی تحریر میں بہت سے اسرار کندہ ہیں مگر ایک نکتے کے حروف قدرے جلی ہیں۔ وہ سرسیّد کو عزیز، اقبال کو عزیز تر اور ہمارے لیے سامانِ زیست ہیں:

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

سرسیّد کی اسی تعلیمی وابستگی کی سعی پر ان کے مشن کا بہت کچھ مدار ہے۔ اسے فلسفے اور شعر کے آہنگ میں ڈھالنے کا کام اقبال نے انجام دیا۔

۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو مردِ خود آگاہ کی وفات کی خبر ملی۔ مولانا میر حسن اور اقبال نے مادۂ تاریخ برآمد کیا۔ اوّل الذکر نے غفرلہ اور علامہ نے قرآن کریم کی آیتِ پاک سے استخراج کیا۔ حیاتِ جاوید میں مولانا حالی نے توثیق کی ہے اور بدونِ حوالہ یہ اندراج موجود ہے: ''اگرچہ سرسیّد کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن دو عربی مادّے عجیب و غریب نکلے ہیں۔ ایک غفرلہ اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت: انی متوفیك و رافعك الی و مطهرك''

دیگر مباحث سے قطعِ نظر سرسیّد تحریک کے اسی اکتساب کا ذکر اقبال کے حوالے سے کرنا چاہوں گا۔ اقبال نے اپنے اکتسابات کی نوعیت کے ساتھ ماخذ و منابع کی پردہ پوشی نہ کر کے بڑی بے باکی سے اظہار بھی کیا ہے۔ خاص طور پر یہ اعتراف بڑی معنویت کا حامل ہے۔

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

یہاں بھی سرسیّد مرحوم کی اساسی تعلیم کی کارفرمائی نمایاں ہے۔ دین و دنیا اور مشرق و مغرب کی تفریق نے نوعِ بشر کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اقدارِ عالیہ ہی انسانی فلاح کے لیے لازم ہیں۔ باقی سب نخیلِ بے رطب کے مانند ہیں۔ سرسیّد نے تعلیم پر جو توجہ دی وہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اقبال فکری تشکیل کے ابتدائی دور سے ہی اس کے نقیب نظر آتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء کی ابتدائی دور کی نظم 'فلاحِ قوم' ہے جو حذف شدہ کلام میں ہے جس کے اشعار میں اسی بنیادی موضوع کو پیش کیا گیا ہے:

جو دوڑ کے لیے میدانِ علم میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم و ذکا و ہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنون

اس نظم سے اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۰ء کی اہم نظم 'نالۂ یتیم' میں پیغمبرِ اعظم و آخر ﷺ سے عاجزانہ التماس ہے:

اے دیارِ علم و حکمت قبلۂ راحت ہے تو
اے ضیائے چشمِ ایماں زیبِ ہر مدحت ہے تو
اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو
امیے بودی و حکمت را نمایاں کردۂ

ہاں دعا کن بہر ما اے مایۂ ایمانِ ما
پرشود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

یہی موضوع اسرارِ خودی میں فلسفیانہ اظہار کے ساتھ نمودار ہوتا ہے:

حرفِ اقرا حق بما تعلیم کرد
رزقِ خویش از دست ما تقسیم کرد
علم از سامان حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویت خودی است

متروک کلام میں سے ۱۹۰۲ء کی ایک اور طویل مگر بے حد مؤثر نظم 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ بہت سے موضوعات ماضی و حال کے اس میں در آئے ہیں مگر اصل توجہ تشویقِ علم پر ہی ہے۔ آٹھویں بند کا اختتام حدیثِ پاک کے آفاقی ارشاد اور تاکید و توثیق پر ہوتا ہے:

جل کے مر جانا چراغِ علم پر مشکل نہیں
پہلے تیرے دل میں پیدا نورِ پروانہ تو ہو
اے کہ حرفِ اطلبوا لو کان باسین گفتۂ
گوہرِ حکمت بہ تارِ جانِ امت سفتۂ

یہی تعلیم کی فضیلت ہے جو ان کے نظامِ فکر میں مختلف پہلوؤں سے نقشِ حیات بن کر ابھرتی ہے۔ ہاں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ یہ علم زمان و مکاں کی تحدید سے آزاد ہے۔ جدید و قدیم دلیل کم نظری ہے تو مشرق و مغرب کا اطلاق بھی بے بصری ہے۔ سرسیّد مرحوم کو مغربی تعلیم اور معیشت سے ایک گونہ انس رکھنے کی وجہ سے ہدفِ تنقید بننا پڑا۔ حالانکہ اچھے اقدار اور مثبت افکار کے حصول میں کوئی شے مانع نہیں ہے۔ کوئی ذی فہم اس کی تائید سے گریز نہیں کرے گا۔ اقبال کے نقادوں نے بھی ان کی مغرب سے بے زاری پر اکثر خفگی کا اظہار کیا ہے۔ اس انتقادی ابلاغ میں اقبال کے اس مرکزی خیال کو نظرانداز کیا گیا جس میں یہ نکاتِ ثبت ہیں:

کھلے ہیں سب کے لیے غربیوی کے مے خانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

یا 'شعاعِ امید' کا حاصلِ شعر:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یا ایک تیسری تمثیل بھی قابلِ توجہ ہے۔ انھیں مثلِ شعاعِ آفتاب رکھنے والی نظر بہت عزیز ہے کیوں کہ

وہ مشرق و مغرب کو خاطر میں نہیں لاتی اور کائنات کو روشن کرتی ہے:

فطرتش از مشرق و مغرب بری است

شاہین بھی پسندیدہ پرندہ ہے کیوں کہ وہ بھی پورب پچھّم کے قید و بند سے آزاد ہے:

یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

اس خیال کی گہرائی اور بے کراں کیفیات نے فکرِ اقبال کو آفاقی افق سے ہم کنار کیا ہے جس کا ایک مصدر:

مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں

جیسا بلیغ اشارہ ہے۔ اقبال کے مؤقر پیشروؤں نے بھی اس خیال کا احاطہ کیا ہے۔ مولانا حالی کا مشہور قول ہے:

حالی اب آؤ پیروِی مغربی کریں

علامہ شبلی کو کم سواد تنقیدی نظر نے حریفِ سیّد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کو بحرِ اوقیانوس میں غرقِ آب دیکھنا چاہتے تھے۔ علامہ شبلی کی نظر اتنی محدود نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس حقیقت سے اجتناب کرسکتی تھی، ہاں ہم نے شاید دانستہ طور پر دانائی نہیں برتی۔ ان کے تصورات میں یہ نکتہ ایک اہم مقام رکھتا ہے:

جادۂ مغربیاں گیر کہ ایں طرزِ نوی
دل پذیر است و دلاویز و دل آرا ماند

راقم اس راست بیانی اور جسارت کے لیے کسی اعتذار کا خواہاں نہیں ہے کہ ہماری تنقیدی نظر ہو یا تفکری بصیرت، وہ ابھی تک چند مفروضات پر ہی مستحضر ہے۔ سرسیّد اور اقبال کی بخشی ہوئی امکانی وسعتوں کی تفہیم اور توضیح کے لیے ہماری دانشوری ہنوز شرر سے شعلے تک رسائی کی منتظر ہے۔

☆☆☆